مجالس النسا کا موضوعاتی تنقیدی تجزیہ

رابعہ تبسم
شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ملخص

حالی کا عہد اردو کا عہد زرّین مانا جاتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب اردو ادب کے افق پر کئی سیاسی، سماجی اور ادبی تحریکات نظر آرہی تھیں۔ ایک طرف حالی کے استاد مرزا غالب نے اپنے خطوط کے ذریعہ جدید اردو نثر کی بنیاد ڈالی تو محمد حسین آزاد نے آبِ حیات کے ذریعہ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ کو پانچ ادوار کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی اور اسی عہد میں ''انجمنِ پنجاب ''لاہور کے پلیٹ فارم سے مغرب سے متاثر ہوکر انھوں نے ایک نئے قسم کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس کو حالی نے بھی لبیک کہا۔ اور یہ تمام کوششیں کسی نہ کسی طرح سرسید تحریک سے جا ملتی ہیں۔ حالی کے دل میں عورتوں کا بڑا احترام تھا اور وہ تعلیم نسواں کے دلدادہ بھی تھے۔ اس بات کا ان کو بہت دکھ تھا کہ عورتوں کو مردوں نے علم کی روشنی سے محروم کر رکھا ہے جس کی پہلی جھلک ''مجالس النسا'' میں نظر آتی ہے، بعد میں یہی درد'' چپ کی داد'' میں ڈھل کر سامنے آیا۔ حالی کی کوششیں صرف قلم تک محدود نہ رہیں بلکہ انھوں نے اپنے خاندان، محلے اور اپنے وطن پانی پت میں لڑکیوں کی تعلیم کو فروغ دیا۔ ''مجالس النسا'' مولوی نذیر احمد کی ''مراۃ العروس'' سے پانچ سال بعد لکھی گئی۔ مقصد دونوں کتابوں کا ایک ہی تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ''مراۃ العروس'' کے مصنف نے یہ کتاب اپنی بیٹیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے لکھی تھی اور ''مجالس النسا'' کے مصنف کے پیش نظر پوری قوم کی بچیوں اور عورتوں کو تعلیم یافتہ بنانا تھا۔ وہ عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے موجودہ نصاب تعلیم ضروری سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ تعلیم و تربیت کے بغیر عورت کی خستہ حالی اور کسمپرسی کو دور نہیں کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

ہندوستان میں انقلاب 1857ء کا سانحہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔اس نے صرف سیاسی انقلاب ہی نہیں برپا کیا بلکہ اس کی وجہ سے سماجی اور اخلاقی قدروں کے معیار میں بھی زلزلہ آ گیا۔تو پھر ادب کیوں کر متاثر نہ ہوتا؟ ادب تو اپنے سماج کا آئینہ ہوتا ہے جس میں زندگی کے تمام رنگ جھلکتے ہیں،جس میں زندگی اپنے تمام حقائق کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ہماری تہذیب یا ہماری زندگی ہی تو وہ زمین ہے جس میں ادب کا بیج اگتا اور بڑھتا ہے۔اس لیے جب زمین ہی بدل گئی تو آسماں کا بھی بدل جانا یقینی تھا۔

غرض کہ 1857ء کی ناکام بغاوت نے ہندوستانی زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔یوں کہا جا سکتا ہے کہ انگریزوں کی آمد سے ہندوستان کے جدید دور کا آغاز ہوتا ہے۔مغل سلطنت کا پوری طرح خاتمہ اور برطانوی سامراج کے استحکام کا اثر ہندوستان کی تہذیبی،تمدنی،علمی وادبی میدانوں میں دن بہ دن بڑھتا جا رہا تھا،ہندوستان میں نئے دور کا آغاز ہو رہا تھا،مشرقی اقدار پر مغربی فکر حاوی ہو رہا تھا۔مذہب،معاشرت،ادب،سیاست ہر شعبے میں تبدیلی آئی۔اس لیے رفتہ رفتہ لوگ خیالی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں آنے لگے۔انگریزوں کی کامیابی کا سب سے بڑا راز اسی میں مضمر تھا کہ وہ خیالی دنیا میں نہیں بستے تھے بلکہ حقیقی دنیا میں بستے تھے۔اس واقعیت کا جب احساس ہوا تو مصلحین قوم نے زندگی کے ہر شعبے میں اپنا اپنا کام شروع کر دیا۔

جب جدید دور آیا تو جدید تعلیم بھی آئی،چونکہ لوگ انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اس لیے انگریزی تہذیب وتعلیم سے بدظنی اور نفرت کا پیدا ہو جانا یقینی تھا۔اور جدید تعلیم کی کھل کر مخالفت کی گئی۔مسلمانوں کے لیے اپنی دینی اقدار،تہذیبی شناخت اور سیاسی وقار کی بحالی اس وقت کا اہم مسئلہ تھا۔چنانچہ زمانہ ایک بڑے پیمانے پر منظم اور اجتماعی جدوجہد کا تقاضہ کر رہا تھا اسی دوران سرسید اور ان کے رفقائے کار نے جس میں ڈپٹی نذیر احمد،خواجہ الطاف حسین حالی،علامہ شبلی نعمانی اور مولوی ذکاء اللہ کے نام قابل ذکر ہیں آسمان ادب پر نمودار ہوئے۔سرسید کی قیادت میں علی گڑھ تحریک ہندوستانی سماج کے اسی دوراہے پر سامنے آئی۔جو کہ اس سلسلے کی سب سے اہم کڑی ہے۔جس نے بہت ہی اہم رول ادا کیا،اس تحریک سے وابستہ شخصیتوں میں مولانا حالی کا نام معروف ترین ہے۔

سرسید تحریک بنیادی طور پر معاشرتی،اصلاحی اور تعلیمی بیداری کی تحریک تھی جس کا بنیادی مقصد عصری تقاضوں اور میلانات ورجحانات سے ذہنی مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرتی ،ادبی اور تہذیبی اقدار کی حفاظت بھی کرنا تھا۔سرسید کے معاصرین میں بعض نکتوں پر کچھ اختلافات نظر آتے ہیں لیکن ان کے تعمیری مقاصد میں شک وشبہات کی گنجائش نہیں ۔ یہ بات تو کافی حد تک درست ہے کہ سرسید نے مسلمانوں میں عصری تعلیم کی روح پھونکی لیکن بقول سید عبداللہ:

"تعلیم نسواں کے متعلق سرسید کے خیالات وہی تھے جو اس وقت کے

عام مسلمانوں کے تھے۔البتہ لڑکوں کی تعلیم کے متعلق وہ چاہتے تھے
ان کا علمی معیار وہی ہو جو کیمبرج اور آکسفورڈ وغیرہ میں ہے۔''
(سید عبداللہ، سرسید اور ان کے نامور رفقاء، ص35)

لیکن ان کی ساری کوششوں کے پیچھے تعلیم نسواں کی گنجائش تھوڑی ہی تھی یا اس پر غور وخوض ہی نہیں کیا گیا تھا۔اکثر تعداد میں عورتیں ان پڑھ تھیں اس کے علاوہ فرسودہ خیالات وعقائد اور غلط رسوم ورواج کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھیں۔سرسید تحریک سے وابستہ ادیبوں میں ڈپٹی نذیر احمد اس کے بعد حالی نے خصوصیت کے ساتھ عورت کی سماجی حیثیت کو بہتر بنانے کی طرف توجہ دی۔اس نقطۂ نظر سے ڈپٹی نذیر احمد کو اوّلیت حاصل ہے کہ انھوں نے پہلی بار تعلیم نسواں کی اہمیت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور ناولوں کو وسیلۂ اظہار بنایا۔ڈپٹی نذیر احمد جنھوں نے انگریزی فقط نام کی پڑھی تھی اور عربی وفارسی میں مہارت رکھتے تھے سب سے پہلے انھیں اصلاح کی ضرورت اپنے گھر میں پیش آئی جب ان کی بچیاں پڑھنے لکھنے کے لائق ہوگئیں تو انھیں اس وقت کوئی بھی کتاب ایسی نہ ملی جس کے ذریعہ انھیں امور خانہ داری اور عام اخلاقیات کا درس دیا جا سکے۔چنانچہ انھوں نے بذات خود ایک قصہ لکھا۔جن کے کچھ حصے لکھ کر روزانہ اپنی بچیوں کو پڑھنے کے لیے دیتے تھے۔ان کے یہی اجزاء مکمل ہو کر بعد میں ''مراۃ العروس'' کے نام سے طبع ہوئے اور لفٹنٹ گورنر یوپی نے انھیں ایک معقول انعام بھی دیا۔''مراۃ العروس'' 1869ء اور ''بنات النعش'' 1873ء محض ناول ہی نہیں بلکہ تعلیم وتربیت کی بہترین کتاب تھی جسے حکومت کی طرف سے انعام بھی ملا اور ''مراۃ العروس'' کے بعد ناول لکھے جانے لگے۔بہ قول علی عباس حسینی:

'' مولانا نذیر احمد کی ''مراۃ العروس نے لڑکیوں کی تعلیم سے متعلق
ناولوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا''
(علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، ص178)

چنانچہ حالی کی ''مجالس النسا''، شاد عظیم آبادی کی ''صورت الخیال'' اور نواب افضل الدین کی ''فسانۂ خورشیدی'' اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں جو اصلاح معاشرت کے مقصد کے لیے لکھی گئیں اور جن کا بنیادی مقصد عورتوں کی تعلیم وتربیت تھا۔خود سرسید کو بھی تعلیم نسواں کی اہمیت کا احساس تھا۔شاعروں میں حالی نے سب سے پہلے عورتوں کو مخاطب کیا:

اے ماؤ! بہنو! بیٹیو! دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہیں، قوموں کی عزت تم سے ہے
تم گھر کی ہو شہزادیاں، شہروں کی ہو آبادیاں
غمگیں دلوں کی شادیاں، دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے

مغربی افکار اور مذہبی خیالات میں حالی اور سرسید ایک تھے ایسا نہیں کہ سرسید تعلیم نسواں کو ضروری نہ مانتے ہوں لیکن اس وقت حالات ایسے دگرگوں تھے کہ عورتوں کی تعلیم کا نظم کرنا مشکل کام تھا اس لیے انھوں نے سوچا کہ پہلے مردوں کی تعلیم پر قوم کو متوجہ کیا جائے حالی بھی سرسید کی اس بات سے اتفاق کرتے تھے مگر ان کے ذہن میں ہمیشہ یہ خیال رہا کہ تعلیم نسواں ضروری ہے۔ان کے زمانے میں عورتوں کو تعلیم دینا عیب اور گناہ سمجھا جاتا تھا ،اس لیے ان کے حقوق اور تعلیم کے لیے آواز بلند کی ۔حالی شاعر اور ادیب تھے انھوں نے قلم کے ذریعہ اپنے خیالات کو لوگوں تک پہنچایا اور اس کے ساتھ ساتھ عملی طور پر بھی کچھ نہ کچھ کرتے رہے۔اس سلسلے میں سب سے پہلے انھوں نے اپنے خاندان کی عورتوں کو تعلیم نسواں کی اہمیت سے آگاہ کیا اور پھر اپنی نواسیوں اور پوتیوں کی جانب توجہ مرکوز کی ،لکھنا اس وقت عورت کے لیے بڑے عیب کی بات سمجھی جاتی تھی ۔چنانچہ عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے حالی کی دلچسپی پر صالحہ عابد حسین رقم طراز ہیں کہ:

''میری والدہ سنایا کرتی تھیں کہ بچپن میں انھیں پڑھنا تو آ گیا تھا لیکن لکھنا سیکھنے کی اجازت نہ تھی اور چونکہ ان کے والد اپنی ملازمت پر رہتے تھے اور دادا دوسرے گھر میں اس لیے گھر میں قلم دوات تک نہ تھی ۔دوپہر کو جب دادی سو جاتیں تو وہ توے کی سیاہی گھول کر اور سرکنڈے کا قلم بنا کر چھپ چھپ کر کسی کتاب کی عبارت نقل کرتیں اور اس طرح انھوں نے لکھنا سیکھا۔ایک مرتبہ ان کی دادی نے دیکھ لیا بہت خفا ہوئیں اور مولانا حالی سے شکایت کی ۔وہ پوتی کا یہ شوق دیکھ کر بہت خوش ہوئے انھیں قلم ،دوات ،قلم دان اور تختی وغیرہ منگا کر دی اور ان کی دادی کو سمجھایا کہ عورتوں کے لیے لکھنا معیوب نہیں بلکہ ایک مفید ہنر ہے۔''

(صالحہ عابد حسین، یادگار حالی، ص106)

سرسید کی طرح حالی بھی تمام برائیوں کا خاتمہ بذریعۂ تعلیم ہی کرنا چاہتے تھے اس میں مرد وزن کی کوئی قید نہ تھی۔ حالی کی نظر میں تعلیم ہی ایک ایسا ذریعہ تھی جس سے قوم ترقی کے منازل طے کر سکتی ہے۔ انھوں نے ملک اور قوم کی بہتری کے لیے عورتوں کی تعلیم اور ان کی اصلاح کو ضروری سمجھا اور اس کے لیے قلم کا سہارا لیا اور تعلیمی بیداری لانے کے لیے ''مجالس النسا'' لکھی۔ تبصرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اس کتاب نے فوراً مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ منشی دیانرائن نگم فرماتے ہیں:

> ''اس وقت کے ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم کو یہ کتاب اس قدر پسند آئی کہ انھوں نے لارڈ ناتھ بروک گورنر جنرل ہند سے سفارش کر کے مولانا حالؔی کو اس تصنیف کے صلے میں چار سو روپے کا انعام دلایا اور پنجاب میں لڑکیوں کے مدرسوں میں یہ کتاب مدتوں پڑھائی جاتی رہی۔۔۔''

(خواجہ الطاف حسین حالی، مجالس النسا، ص6)

حالی نے اپنی اس کتاب کا نام ''مجالس النسا'' رکھا۔ باب کی جگہ مجلس کا استعمال کیا جو کہ اس بات کا ثبوت ہے کہ حالی نے اپنی اس کتاب کو صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے تعظیم دینے کی کوشش کی ہے۔ فضلی کی ''کربل کتھا'' کے بعد غالباً حالی نے پہلی بار مجالس کے تحت اپنے مقاصد کو تحریر کر کے جدت طرازی کا نمونہ پیش کیا ہے موجودہ دور میں حقوقِ نسواں اور تعلیم نسواں کا بڑا چرچہ ہے مگر آج سے ڈیڑھ سو سال قبل حالی نے ''مجالس النسا'' کے ذریعے اس جانب جو پیش رفت کی ہے انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔

حالی نے اس کتاب کو دو حصوں اور نو مجلسوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہر مجلس اصلاح پر مشتمل ہے۔ کہیں تعلیم کو لے کر، کہیں عادت کو لے کر تو کہیں لحاظ اور طور طریقے کو لے کر بات کی گئی ہے۔

آتو جی (استانی) اور مریم بیگم کی آپسی گفتگو سے کہانی شروع ہوتی ہے۔ حالی نے ''مجالس النسا'' کی استانی ''آتو جی'' کی زبانی یہ کہلوایا ہے کہ:

> ''ہمارے ملک کے ہندو مسلمان جو اشراف کہلاتے ہیں سب کے ہاں

قدیم سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ بیٹی کو کچھ پڑھائیں یا نہ پڑھائیں، پر
بیٹے کو ضرور پڑھواتے ہیں۔ کیا غریب اور کیا امیر، ہر شخص اپنی بساط
کے موافق بیٹے کی تعلیم میں ضرور کوشش کرتا ہے۔''

(خواجہ الطاف حسین حالی، مجالس النسا، ص15)

آتو جی بچوں کی تعلیم و تربیت کو لے کر بہت فکر مند رہتی ہیں کہ آج کل کے لڑکے کیا کریں گے؟ ان کی عادتیں کیوں نہیں سدھرتیں؟ ان کو آدمیت کیوں نہیں آتی؟

حقیقت میں یہ آتو جی نہیں بلکہ حالی کی فکر مندی اس میں صاف طور پر نمایاں ہے کہ آج کل کے نوجوان تعلیم کی طرف راغب کیوں نہیں ہو رہے ہیں؟ ان کے والدین ان کے علم کو لے کر فکر مند کیوں نہیں ہیں؟ کسی نے پوچھا تو کہہ دیا:

''میاں! اپنی اپنی قسمت ہے، جس کے نصیب اچھے ہوئے وہ کچھ لے
نکلا، جو بدنصیب ہوا وہ رہ گیا۔''

(خواجہ الطاف حسین حالی، مجالس النسا، ص15)

پہلی مجلس میں طور طریقے کو لے کر بات کی گئی ہے۔ تعلیم اور نظام تعلیم پر عمومی گفتگو ہے۔ پرانے زمانے کے رسم و رواج پر طنز کیا گیا ہے اور قاری یہ سوچنے پر مجبور کیا گیا ہے کہ بیٹے اور بیٹیوں میں فرق نہیں کرنا چاہئے بلکہ دونوں کو برابر کی تعلیم دینا چاہئے۔ انھوں نے اس رویے کو بھی غلط قرار دیا ہے کہ قسمت میں ہوگا تو بچہ پڑھ جائے گا۔ قسمت کا سہارا لے کر اپنی کوتاہیوں کی پردہ پوشی نہیں کرنی چاہئے۔ یہاں تو یہ سوچ کر لڑکوں کو تعلیم دی جاتی ہے اور لڑکیوں کو نہیں کہ لڑکیوں کی کمائی سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر اقتباس پیش ہے:

''ماں باپ نے یہ سمجھا تھا کہ بیٹوں کی کمائی میں تو ہمارا ساجھا ہے
اور بیٹیوں سے ہم کو کچھ کہنا نہیں۔ آؤ جہاں تک ہو سکے بیٹوں کا
پڑھائیں جو کل کو ہمارے بھی کام آئے، خدا کو یہ بات ناپسند آئی، اس
نے بیٹوں کو بیٹیوں سے بھی بدتر کر دیا۔ وہ تو عورت ہو کے ان پڑھ

رہی تھیں، یہ مرد ہو کے جاہل رہے۔''

(خواجہ الطاف حسین حالی، مجالس النسا، ص17)

حالی کا نظریہ ہے کہ اگر لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہ ہوگا تو کہیں قیامت میں خدا سے یہ نہ کہیں:

''بیٹیوں کو علم کی دولت سے کیوں محروم رکھا؟ ان کو بیٹوں کی برابر کیوں نہ عزیز سمجھا؟ ان کو دین کا رستہ کیوں نہ بتایا؟ ان کو دنیا کی برائی بھلائی سے کیوں نہ خبردار کیا؟ ہم نے ان کو اس لیے نہیں بنایا تھا کہ ماں باپ کے گھر کتے، بلی کی طرح پرورش پائیں اور خاوند کے ہاں جا کر لونڈیوں کی طرح اپنے دن پورے کریں.....گھر کی چار دیواری میں علم کی دوربین ان کی آنکھ پر لگی ہو، کتاب ان کی بہنیلی ہو اور کاغذ، دوات، قلم ان کی سہیلیاں ہوں۔ افسوس انھوں نے دنیا کے سارے حق ادا کیے پر دنیا نے ان کا کوئی حق ادا نہ کیا۔''

(خواجہ الطاف حسین حالی، مجالس النسا، ص18)

حالی نے بتایا ہے کہ ماں کی جہالت اور معلمین کی کم علمی، ناتجربہ کاری اور لا پروائی کے باعث بچوں میں مختلف بری عادتیں پنپنے لگتی ہیں۔ مثلاً کتابوں سے بے رغبتی، اسکولوں اور استادوں سے خوف اور بد دلی وغیرہ۔ اور اس طرح وہ تعلیم کو ترک کر کے بری صحبت اختیار کر لیتا ہے۔ اس لیے بچے کو کسی استاد کے حوالے کرنے سے پہلے استاد کی عادات واطوار کے بارے میں پتہ کرنا بہت ضروری ہے۔

جدید علم نفسیات کی رو سے ماں اور معلم کے عادات واطوار کے اثرات بچوں پر سیدھا اثر کرتے ہیں۔ ایک معلم کو بچوں کے مزاج کا علم رکھنا بہت ضروری ہے کیوں کہ بچے الگ الگ ذہنیت کے مالک ہوتے ہیں۔ اگر استاد ایسا نہیں کرے گا اور سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا شروع کر دے گا تو بچوں پر اس کا اثر بہت برا ہو سکتا ہے۔ اس لیے بچے کو پڑھانا ایسا ہے جیسے بیمار کا علاج کرنا، یعنی جس طرح ایک ڈاکٹر بیمار کا مزاج پوچھتا ہے اور پہچانتا ہے بالکل اسی طریقے سے معلم کو بھی بچے کا مزاج داں ہونا بہت ضروری ہے۔ حالی کے لفظوں میں:

''اگر بچوں کا استاد کامل نہ ہوگا، کبھی ان کو پڑھنا لکھنا نہیں آنے
کا۔ بچے کو ایسا سمجھو جیسے توت کی ٹوٹی گیلی لکڑی، اس وقت تو اس میں
ایک لوچ ہے جس طرح موڑو گے مڑ جائے گی۔

(خواجہ الطاف حسین حالی، مجالس النسا، ص24)

یہ وہ سب باتیں ہیں جس کے تعلق سے حالی نے باقاعدہ کوشش کی ہے کہ ان عورتوں کو بہترین مقام مل سکے۔ نیز یہ بھی بتایا ہے کہ حد سے زیادہ لاڈ پیار بچوں کو خراب کر دیتا ہے۔ اس بات پر بھی حالی نے زور دیا ہے کہ بچوں کے لیے انا رکھنا ہو تو دو باتیں اس کے اندر ضرور ہونی چاہئے۔ اول یہ کہ شریف ہو دوسرے یہ کہ خوش مزاج اور غیرت مند ہو کیوں کہ ان کی خصلتیں بچوں کے اندر اثر انداز ہوتی ہیں۔ دوسری مجلس میں فرماتے ہیں کہ کھلونے صرف بچوں کے لیے تفریح کا سامان نہیں ہوتے بلکہ ان کے ذریعہ اہم سے اہم اور اخلاقی سبق سکھائے جا سکتے ہیں۔ اچھی اور بری عادتوں کو انھوں نے کھلونوں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ مثلاً زبیدہ کے لیے انا کا انتخاب بڑے اہتمام سے کیا گیا تھا وہیں ان کی تعلیم و تربیت کے لیے کھلونوں کا انتخاب بھی بڑے اہتمام کے ساتھ کیا گیا تھا۔ ایک ایک کھلونے کے ذریعہ انھیں بہتر تعلیم و تربیت کی جاتی تھی۔

حالی نے جہاں مسلمانوں میں رائج فرسودہ روایات، توہم پرستی، غفلت اور جہالت کو موضوع بحث بنایا ہے وہیں انگریزی تعلیم کی برکت اور ملکہ وکٹوریہ کی ذہانت کی تعریف بھی کی ہے۔ ان کے کئی اچھے واقعے بھی سنائے ہیں، ان کی شجاعت، بہادری اور دلیری کے بھی قصے سنائے ہیں۔ علی عباس حسینی اسے مدح خوانی اور انگریز مربیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی ترکیب قرار دیتے ہیں:

''ایک بات جو اور کھٹکتی ہے وہ اس میں جا بجا انگریزی اور ملکہ وکٹوریہ
کی مدح خوانی ہے۔ بچوں کے لیے بطور نمونہ اور امثال ہر بار ملکہ
وکٹوریہ ہی پیش ہوتی ہیں۔ کیا حالی کو اسلامی یا ہندوستانی خواتین
میں کسی کی سیرت ایسی نہیں ملتی تھی جس کی تعریف کرتے اور وہ اپنی
بچیوں کو تبلیغ کرتے؟ ممکن ہے کہ انگریز مربیوں کی خوشنودی کے لیے
یہ حصے لکھے گئے ہوں۔''

(آفتاب احمد آفاقی، معنی شناسی، ص87)

لیکن واقعہ یہ ہے کہ 1857ء کے انقلاب نے ہندوستانی مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔انگریز انھیں سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے۔یہ مسلمانوں پر بہت نازک وقت تھا کیوں کہ اس وقت مسلمان ہر اعتبار سے بالکل کورے تھے۔حالی انگریزوں کی تعریف اس لیے کرتے ہیں کہ ان کی حکومت آنے سے قومی تصور پروان چڑھا۔جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ہوا۔ان کے قائل ہونے کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان کے اندر روشن خیالی کے ساتھ ساتھ تحصیل علم کا بھی جذبہ تھا۔

سرسید حالات کے بہت بڑے نباض تھے انھوں نے مسلمانوں کی خستہ حالت کا مطالعہ بخوبی کیا تھا۔اوران کی اسی حالت نے سرسید تحریک کو پیدا کیا۔اوران کی تحریک نے ان حالات کو سامنے رکھ کر زندگی کے چند اصول بنائے تھے۔ان اصولوں کا خیال اس وقت کی زندگی کے لیے ضروری تھا۔

''مجالس النسا'' میں تاریخی واقعات کی بھی جھلک ملتی ہے۔ملکہ وکٹوریہ کی تعریف وتوصیف سے قبل شاہ جہاں کی بیٹی روشن آرا بیگم کی گوناگوں صفات بھی مندرجہ ذیل ہیں:

> ''علم بڑی شے ہے۔اگلے زمانے میں جو پڑھی لکھی عورتیں گزری ہیں انھوں نے مردوں سے بھی بڑھ کر کام کیے ہیں۔شاہ جہاں بادشاہ نے اپنی بیٹی روشن آرا بیگم کو خوب پڑھایا لکھایا تھا۔جب عالمگیر نے باپ کو قید کیا تو روشن آرا نے باپ کا ساتھ نہ چھوڑا اور آپ بھی شاہ جہاں کے ساتھ قید خانہ میں چلی گئی اور لونڈیوں کی طرح باپ کی خدمت کرتی رہی۔دیکھو عالمگیر سا بیٹا، پڑھا لکھا، مولوی، نمازی، پرہیز گار، اس نے تو باپ کے ساتھ وہ سلوک کیا، اور بیٹی نے یہ حق ادا کیا کہ آج تک لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔یہ ساری علم کی خوبیاں ہیں۔''
>
> (خواجہ الطاف حسین حالی، مجالس النسا، ص 51)

حالی یہ بتادینا چاہتے ہیں کہ علم ہی وہ شے ہے جس کی بدولت انسان نیک کام کرنے سے کبھی نہیں گھبراتا جیسا کہ شاہ جہاں کی بیٹی روشن آرا نے اپنے کارنامے سے اس کا ثبوت بھی پیش کردیا۔اور ساتھ ہی ساتھ تعلیم کی اہمیت اور افادیت پر بھی روشنی ڈالنا ان کا مقصد تھا۔اس میں لڑکا اور لڑکی کی قید نہیں ہے۔

مسلمانوں میں رائج فرسودہ روایت ،توہم پرستی ،غفلت اور جہالت ،لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کے علاوہ حالی نے سینے پرونے اور امورِ خانہ داری کے مسائل کو موضوع بحث بنایا۔ چنانچہ حالی امورِ خانہ داری کے تعلق سے ''مجالس النسا'' کی چوتھی مجلس میں لکھتے ہیں:۔

> ''آدمی جو ہنر سیکھتا ہے یا تو خوشی سے سیکھتا ہے یا لاچاری سے اور جو کام کرتا ہے یا تو اپنے شوق سے کرتا ہے یا کسی کے دباؤ سے۔ مگر اتنا فرق ہے کہ جو بات دل کی امنگ سے ہوتی ہے اس سے کبھی جی نہیں گھبراتا اور دل لگتا ہے۔ اور جو کام ایکبارگی سر پر آپڑتا ہے وہ دوبھر معلوم ہوا کرتا ہے۔''

(خواجہ الطاف حسین حالی، مجالس النسا، ص59)

حالی نے ایک خاص مقصد کی طرف اشارہ کیا ہے کہ پڑھی لکھی خاتون خانہ داری چلاسکتی ہیں۔ گھر کی دیکھ بھال سلیقے سے کرسکتی ہیں، بچوں کی اچھی تعلیم وتربیت اور پرورش وپرداخت کا انحصار ایک ماں کے تعلیم یافتہ ہونے پر منحصر ہے۔

حالی نے عورتوں میں مروجہ توہم پرستی ،فرسودگی اور رسم ورواج کے متعلق جو باتیں لکھی گئی ہیں وہ انیسویں صدی عیسوی میں مسلم معاشرے میں ایک راہ پا چکی تھیں اور خانگی اور معاشرتی زندگی میں لازمی طور پر ان خرافات کو اپنا لیا گیا تھا جو کہ ایسے منفی اثرات تھے جن سے سیاسی ،سماجی ،اور اقتصادی زندگی پوری طرح متاثر تھی۔ حالی نے جاہلیت اور بدعقیدگی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے طرح طرح کے خرافات اس زمانے میں رائج تھے، ان میں کچھ ٹوٹکے ابھی بھی کہیں کہیں رائج ہیں۔ زبیدہ کی والدہ اپنی بیٹی کو جاہل عورتوں کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے سے منع کرتی ہیں، چنانچہ اس سلسلے میں کہتی ہیں کہ:

> ''ایک نیا مذہب سارے جہان سے نرالا، ساری خدائی سے انوکھا، نہ جس کا قرآن میں پتہ، نہ جس کا حدیث میں ذکر، وہ البتہ سیکھ جاؤ گی..... میں نے کہا اماں جان! کیا عورتوں کا، مذہب دور پار سب سے جدا ہے۔؟ کہا بیٹا! کیا تم نے ان کے مسئلے نہیں سنے؟..... ایک

بات ہوتو کہوں، انھوں نے تو ہزاروں خرافات جوڑ رکھے ہیں۔''

(خواجہ الطاف حسین حالی، مجالس النسا، ص 71)

پانچویں مجلس میں حالی نے علم کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ علم سب سے بڑی دولت ہے جو کہ صاحب نصیب کو ملتی ہے۔ ایک تعلیم یافتہ عورت اپنے کنبے میں ایک چراغ کے مانند ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرد کی تعلیم ایک فرد کی تعلیم ہے اور ایک عورت کی تعلیم پورے خاندان کی تعلیم ہے۔ کم تعلیم والا انسان ''نیم طبیب خطرۂ جان اور نیم ملا خطرۂ ایمان'' کے مصداق ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ کم علم والا انسان بعض دفعہ ایسی باتیں کر گزرتا ہے جو کہ ایک ان پڑھ انسان بھی نہیں کر سکتا۔ حالی نے اس زمانے میں رائج فضول خرچی اور بے ہودہ رسم ورواج کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ جیسے کہ لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینا، بیوہ عورتوں سے نکاح نہ کرنا، بیاہ شادیوں میں فضول خرچی، میت پر بھی فضول خرچی، تہوار وغیرہ میں فضول خرچی وغیرہ۔ فضول کی رسمیں تو بری ہوتی ہی ہیں مگر بعض رسمیں تو حد سے زیادہ بری ہوتی ہیں۔ جن کو لوگ اپنا دین ایمان مان کر نبھاتے ہیں اور اپنے باپ دادا کی رسموں پر جان نچھاور کر دیتے ہیں جو کہ خطرۂ ایمان ہے۔

فرسودہ روایات اور توہمات کی بھی حالی نے کھل کر مخالفت کی ہے۔ مثلاً بیماری میں ڈاکٹروں کے پاس نہ جا کر خود ہی گھر میں خرافاتی ٹوٹکے آزمانا، اور جن عورتوں کی کوئی اولاد نہیں جیتی ان کے تو الگ ہی خرافات ہیں جیسے کہ ایسی عورتوں کا میت میں جانا اور چھٹی میں نہ جانا اور منتیں مان کر قبروں پر بکرے چڑھانا وغیرہ وغیرہ۔ ان کا نظریہ ہے کہ شادی بیاہ کے موقع پر فضول خرچی کرتے ہیں، تہوار کے نام پر فضول خرچی کرتے ہیں، شب برات وغیرہ کے مواقع پر حلوے کا اہتمام لازمی ہے تو پھر تعلیم پر کیوں نہیں؟ حالی کے عہد میں شریف خاندانوں میں لڑکیوں کی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لڑکے کی پیدائش پر خوشیاں منائی جاتی تھیں اور لڑکی کی پیدائش پر سوگ۔ بلکہ لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا، اگر ایسا نہیں بھی کیا گیا تو لڑکے اور لڑکی کی تعلیم وتربیت اور پرورش میں امتیازی سلوک برتا جاتا تھا، لڑکیوں کی ناقدری کی جاتی تھی۔ شادی کے وقت لڑکی کی رضامندی نہیں لی جاتی تھی۔ بیوہ کی شادی کو بہت بڑا عیب بلکہ گناہِ عظیم سمجھا جاتا تھا۔ عورتوں کے بیوہ ہونے پر اس سے ہمدردی اور محبت کے بجائے سماج میں اس سے دوری اختیار کر لی جاتی تھی۔ خوشی کی محفلوں میں ان کی موجودگی کو منحوس سمجھا جاتا تھا حتی کہ انھیں جائداد میں بھی حصہ نہیں دیا جاتا تھا۔

مولانا حالی نے ہمیشہ رجعت پسند خیالات کی مخالفت کی ہے جیسا کہ اس عہد کے لوگوں کا رویہ تھا کہ عورتوں کو اتنی ہی تعلیم دی جانی چاہئے جس سے وہ گھر کی معمولی باتوں کو اچھی طرح سمجھ سکے۔ جب کہ مولانا حالی

عورتوں کو اس وقت کی مروجہ تعلیم سے آراستہ کرنے کے بجائے اعلیٰ تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کرنا چاہتے تھے تا کہ یہ مظلوم طبقہ صنف بدتر کے بجائے صنف برتر کہلائے۔ چنانچہ حالی نے مسدس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی کہانی نہایت ہی غم واندوہ کی کیفیت میں بیان کی ہے۔

گلکس امید پر تم کھڑے ہنس رہے ہو
براوقت بیڑے پہ آنے کو ہے جو
نہ چھوڑے گا سوتوں کو اور جاگتوں کو
بچو گے نہ تم اور نہ ساتھی تمھارے
اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے

حالی کے خیال میں ان فرسودہ رسم ورواج اور توہم پرستی کو بدلنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انھوں نے ''مناجات بیوہ'' میں بھی خواتین کے درد کی عکاسی کی ہے۔ اس کے علاوہ اپنی معروف نظم ''چپ کی داد'' میں بھی عورتوں کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو بھی ظاہر کیا ہے۔ اس کے چند اشعار

افسوس دنیا میں بہت تم پر ہوئے جور و جفا
حق تلفیاں تم نے سہیں، بے مہریاں جھیلیں سدا
گو نیک مرد اکثر تمھارے نام کے عاشق رہے
پر نیک ہوں یا بد، رہے سب متفق اس رائے پر
جب تک جیو تم علم ودانش سے رہومحروم یہاں
آئی تھیں جیسی بے خبر، ویسی ہی جاؤ بے خبر

یہ بھی بتایا گیا ہے کہ شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکے کی رضامندی پوچھ لینا چاہئے کیوں کہ یہ ان کی زندگی کا سوال ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ بیٹوں کی شادی کم عمری میں نہیں کرنی چاہئے لڑکوں کے لئے کم سے کم پچیس برس کی عمر میں کرنی چاہئے۔ کم عمری میں شادی کرنے کے نقصان بھی بتلائے ہیں۔ بچپن کی شادی، جہیز کی لعنت، اور بیوہ عورتوں سے شادی کی مخالفت جو کہ ہندوستانی معاشرت پر ایک

بدنما داغ ہے۔جس نے کروڑوں معصوم زندگیاں تباہ و برباد کردی ہیں۔ان فرسودہ رسوم کے خلاف اور حقوق نسواں کے تعلق سے سب سے پہلے حالی نے آواز بلند کی۔ایک مختصر سی نظم انھوں نے ہندوستان میں لڑکیوں کی غیر موزوں شادیوں پر کہی ہے۔جس میں انھوں نے بتایا کہ لڑکیوں کے لیے صرف اچھا خاندان ہی دیکھا جاتا ہے ۔داماد کی تعلیم اور چال چلن نہیں دیکھی جاتی۔

چھان بین اس کی تو کرتے ہیں کہ گھر کیسا ہو
پر نہیں دیکھتا یہ کوئی کہ کیسا ہے بر
بدمزاجی ہو، جہالت ہو کہ بد چلنی
کچھ برائی نہیں قابل نہیں داماد اگر

حالی نے زمانۂ جاہلیت کی لڑکیوں کو زمین میں زندہ درگور کرنے کی ظالمانہ رسم کا ذکر اپنے ایک قطعے میں کرتے ہیں اور یہ بھی نشاندہی کرتے ہیں کہ عصر حاضر میں بھی لوگ لڑکیوں کے رشتے تلاش کرتے ہیں تو صرف جو معاشی اعتبار سے مضبوط ہو یا اعلیٰ ذات سے تعلق رکھتا ہو اسی کو بنیاد بنا لیتے ہیں لیکن کردار اور مزاج کی چھان بین کرنا ضروری نہیں سمجھتے اور اس طرح نالائق شوہر کی وجہ سے لڑکیاں زندہ درگور ہو جاتی ہیں۔قطعہ ملاحظہ ہو

جاہلیت کے زمانے میں تھی یہ رسم قدیم
کہ کسی گھر میں اگر ہوتی تھی پیدا دختر
سنگ دل باپ اسے گود سے لے کے ماں کی
گاڑ دیتا تھا زمیں میں کہیں زندہ جا کر

ان تمام برائیوں کا ایک ہی حل انھوں نے تلاش کیا کہ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت قاعدے سے ہونی چاہئے۔اگر قوم کی لڑکیاں ایک بار تعلیم سے آراستہ ہو جائیں گی تو وہ اپنے بچوں کو خود ہی پڑھالیں گی اور اس طرح یہ روایت چل نکلے گی۔اس حوالے سے حالی نے مغرب کی مثالیں دی ہیں جو فرنگیوں سے متعلق ہیں کہ وہاں ان پڑھ لوگ نہیں ہوتے ہیں۔وجہ اس کی یہ ہے کہ وہاں تعلیم شروع ہی سے چلی آرہی ہے۔

ان نصیحتوں کے علاوہ حالی نے بول چال اور انداز گفتگو کے بہترین طریقے بھی بتائے ہیں۔آج بھی بہت سارے لوگ اس طرح کے جملے بولتے ہیں اور اپنی روزمرہ کی ادبی زندگی میں اس کو استعمال کرتے

ہیں۔مثال کے طور پر۔ بڑوں کے آنے کو تشریف لانا،اور جانے کو تشریف لے جانا، بلانے کو یاد کرنا،اوران کے مزاج کو مزاج مبارک، یا مزاجِ عالی،اوران کے سلام کو تسلیم یا آداب، یا کورنش، یا بندگی،ان کے گھر کو دولت خانہ،ان کے کہنے کو فرمانا، یا ارشاد کرنا،اوران کی اولاد کو صاحب زادہ یا صاحب زادی اوران کے نام کو اسمِ مبارک یا اسمِ سامی یا اسمِ شریف اوران کے وطن کو وطن مالوف کہنا چاہئے۔اسی طرح اپنے آنے کو حاضر ہونا اور کہنے کو عرض کرنا،گھر کو غریب خانہ اور اپنے لیے 'ہم' کا استعمال کرنا اور اپنے نام کے ساتھ سیّد یا شیخ یا مرزا لگانا بڑی بے وقوفی کی بات ہے۔اور جو شخص عمر اور رتبے میں برابر ہے اس کو تم یا آپ کہنے میں اختیار ہے۔

زبانیں سیکھنے کے سلسلے میں یہ نصیحت کی گئی ہے کہ انسان کو کئی کئی زبانیں سیکھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔لیکن پہلے انسان کو اپنی زبان درست کرنا اور کمال حاصل کرنا چاہئے نہیں تو وہی مثال ہو جائے گی کہ ؎

کوّا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھول گیا

حالی نے ساتویں مجلس میں یہ بھی بتایا ہے کہ علم پڑھانا کڑوی دوا پلانے کے مساوی ہے۔جس طرح کڑوی دوا حلق سے جلدی نہیں اترتی تھوڑی تھوڑی کر کے اترتی ہے بالکل علم بھی ویسے ہی ہے۔ یکبارگی علم کا بوجھ کسی بچے پر نہیں ڈال دینا چاہئے بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے دینا چاہئے۔اور جب بچہ اکتا جائے تو کھیلنے کی مہلت بھی دینی چاہئے کیوں کہ علم کے ساتھ ساتھ کھیل بھی بہت ضروری ہے۔کھیل کے علاوہ پڑھائی کے دوران قصے کہانیوں کے ذریعہ بھی بچوں کا دل بہلایا جا سکتا ہے۔اور بچوں کو اخلاقی درس دیا جا سکتا ہے۔

آگے کہتے ہیں کہ اگر آدمی اپنی عقل سے کام نہ لے اور جس حال میں ہے اسی حال میں خوش رہے تو بھلا آدمی اور جانور میں کیا فرق رہ جائے گا؟اس لیے بزرگوں نے کہا ہے کہ:

> ''آدمی کو چاہئے کہ ہمیشہ علم وہنر سیکھنے میں قدم بڑھاتا چلا جائے، جو آج معلوم ہے وہ کل نہ تھا،اور جو کل معلوم ہوگا وہ آج نہیں ہے''

حالی کی ''مجالس النسا'' ایک سیدھی سادی اصلاحی اور مقصدی کہانی ہے لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے قصے کے ربط وترتیب میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے اور اسے کسی جگہ بے ڈھنگا نہیں ہونے دیا۔انھوں نے اپنی بات کے اظہار کے لئے نہ تو اتنے جوش سے کام لیا ہے کہ قصے کی فضا غیر فطری ہو جائے اور نہ

ہی اتنے مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے کہ سچ پر جھوٹ کا احتمال ہونے لگے۔انداز بیان سادہ، بے تکلف اور پر اثر ہے۔ اس کتاب میں جگہ جگہ مفید نصیحتیں بھی ملتی ہیں لیکن تلخی اور واعظانہ خشکی کہیں نہیں ہے۔خلوص، محبت، ہمدردیاور دوستی کے گاڑھے رنگ پوری کتاب پر چھائے ہوئے ہیں۔چنانچہ سید وقار عظیم ان کے انداز بیان کو یوں سراہتے ہیں:

> ''ان کا انداز بیان منطقی انداز میں سوچنے والے کسی معلم کے بجائے ایک ایسے ہمدرد ناصح کا سا ہے جس کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ کچھ کہے اس میں دل کشی اور دل نشینی ہو۔.....آگے کہتے ہیں کہ مناسب تمہید کے ساتھ بات کو اس طرح ابھارا ہے کہ جیسے کلی آہستہ آہستہ پھول بن رہی ہے۔.....اور غیر محسوس طریقے پر ہر جگہ ایسی بات کہی ہے جو نصیحت ہونے کے باوجود پھول کی طرح رنگین اور خوشبودار اور اس لیے دلکش اور دل نشین ہے۔''

(وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، ص 51)

غرض ''مجالس النسا'' جس وقت لکھی گئی اپنے وقت کی اہم ضرورت تھی، اسی لیے مقبول بھی ہوئی اور انعام بھی ملا۔حالی کی خدمات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کیوں کہ انھوں نے سب سے پہلے قلم کے ذریعہ جدو جہد کی۔مضامین اور نظمیں لکھ کر مختلف مقام پر عورتوں کی پُر زور وکالت بھی کی۔اس کے علاوہ عملی کوششیں بھی کیں، پانی پت میں لڑکیوں کا اسکول قائم کیا۔خصوصاً طبقۂ نسواں کے ہر شعبے میں خواتین کی رہنمائی کی اور اصلاح کا کام کیا۔ کیوں کہ عورتوں کو تعلیم کی روشنی سے دور رکھنا معاشرے کی پسماندگی کا باعث ہے۔آج کہنے کو اطلاعاتی ٹکنالوجی ہے لیکن سماج کی برائیاں وہی ہیں جو پہلے تھیں۔لڑکیوں کے ساتھ ناروا سلوک پہلے بھی تھا، آج بھی ہے۔اتنی ترقی ہونے کے باوجود آج بھی لڑکیوں میں تعلیم کی شرح وہ نہیں ہے جو ہونا چاہیے۔گھروں میں مظالم، جہیز کا لین دین، جوڑے توڑے اور مردوں سے کم تر سمجھنا وغیرہ وغیرہ سماجی برائیاں اور مسائل ہنوز باقی ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ آج بھی حالی کی طرح کوئی اٹھے اور ایک جدید مجالس النسا کو ضبط تحریر میں لائے جس میں مزید مسائل کی نشاندہی کر کے معاشرے کی اصلاح کرنے کی کوشش کرے۔